نیّر مسعود کی خاکہ نگاری کا تہذیبی سیاق

Cultural Context of Naiyer Masud 's Sketching

صدف منیر[i]   ڈاکٹر فرزانہ کوکب[ii]

Abstract:

India has for centuries been a center of diverse languages, cultures, and civilizational traditions. The cultural diversity and linguistic plurality of this region have endowed social life with a unique identity. Cultural change occurs gradually and, passing from one generation to another, becomes a part of the collective consciousness. In this context, the sketch writing of Naiyer Masud emerges as an important medium for preserving this cultural continuity and its evolution. In his sketches, one finds not only portrayals of personalities or places but also a vivid depiction of the cultural, social, and intellectual conditions of his time. Viewed in this perspective, Naiyer Masud's collection of sketches Adabistan occupies a prominent place in the tradition of Urdu sketch writing. These sketches are not merely character portrayals; they also artistically present the cultural and social atmosphere of the author's era. In Naiyer Masud's writings, elements such as natural wit, warmth, subtle humor, and liveliness appear as distinctive features, making his style engaging and impactful. Thus, Adabistan not only highlights the aesthetic values of Urdu sketch writing but also, through its rich cultural context, vivid imagery, and eloquent expression, emerges as an important milestone in Urdu literature.

Keywords: *Urdu Literature, Lucknow, Adbistan, Sketch Writing, Aesthetic Values, Cultural Context, Imagery, Eloquence, Naiyer Masud.*

ہندوستان صدیوں سے مختلف زبانوں، ثقافتوں اور تہذیبی روایتوں کا مرکز رہا ہے۔ یہاں کی تہذیبی رنگا رنگی اور لسانی تنوع نے معاشرتی زندگی کو ایک منفرد شناخت عطا کی ہے۔ تہذیب میں تبدیلی کا عمل بتدریج وقوع پذیر ہوتا ہے اور ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہو کر اجتماعی شعور کا حصہ بن جاتا ہےنیر مسعوکی خاکہ نگاری اسی تہذیبی تسلسل اور اس کے ارتقا کو محفوظ کرنے کا اہم ذریعہ بن کر سامنے آتی ہے۔ ان کے خاکوں میں صرف شخصیات یا مقامات کی عکاسی نہیں بلکہ تہذیبی، معاشرتی اور فکری حالات و واقعات کی ایک جیتی جاگتی تصویر بھی ملتی ہے۔ اسی تناظر میں نیر مسعود کے خاکوں کا مجموعہ ادبستان اُردو خاکہ نگاری کی روایت میں ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ ان خاکوں میں محض شخصی خاکہ نگاری نہیں بلکہ اپنے عہد کی تہذیبی اور سماجی فضا کو بھی نہایت سلیقے اور فنکارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ نیر مسعود کی تحریروں میں فطری شوخی، خوش دلی، بذلہ سنجی اور شگفتگی نمایاں عناصر کے طور پر جلوہ گر ہوتی ہیں، جو ان کے اسلوب کو دلکش اور اثر انگیز بنا دیتی ہیں۔ اس طرح ادبستان'' نہ صرف اُردو خاکہ نگاری کی جمالیاتی قدروں کو اجاگر کرتا ہے بلکہ تہذیبی سیاق، منظر نگاری اور فصاحت و بلاغت کے حسین امتزاج کے ذریعے اُردو ادب میں ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت بھی اختیار کر لیتا ہے۔

کلیدی الفاظ: اردو ادب، لکھنؤ، خاکہ نگاری، جمالیاتی قدریں، تہذیبی سیاق، منظر نگاری، فصاحت و بلاغت، نیّر مسعود۔

اُردو فارسی زبان و ادب اور ہند ایرانی تہذیب کے عاشق اور غزل کے رمز آشنا پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کی ادبی روایت کے وارث نیر مسعود نے خود اپنی قوتِ بازو سے اپنی ادبی جائیداد میں گراں قدر

[i] اسکالر پی ایچ۔ ڈی، شعبہ اُردو، بہاءُ الدین زکریا یونی ورسٹی، ملتان۔
[ii] صدر نشین، شعبہ اُردو، بہاءُ الدین زکریا یونی ورسٹی، ملتان۔ (Corresponding Author)

اضافہ کیا۔ نیر مسعود نے فارسی زبان و ادب کے بلند پایہ عالم ہونے کے باوجود اُردو افسانے کی زبان لکھتے وقت فارسی زیورات، پیچیدہ تراکیب اور غیر ضروری صنائع بدائع سے بوجھل نہیں کیا بلکہ خود اُردو ہی کے گھنے پاتوں سے اپنی نثر کو سرسبز کیا۔ ان کے افسانوی مجموعے سیمیا ۱۹۸۴ء، عطر کافور ۱۹۹۰ء، طاؤس چمن کی مینا ۱۹۹۸ء، گنجفہ ۲۰۰۸ء میں بالترتیب شائع ہو چکے ہیں۔ افسانوی اور تنقیدی کتب کے علاوہ ایک شخصی خاکوں کا مجموعہ ادبستان کے عنوان سے شہرزاد کراچی سے ۲۰۰٦ء میں منظرِ عام پر آیا۔

ادبستان شخصی خاکوں کا مجموعہ ہے۔ادبستان کے خاکے مختلف وقتوں میں حادثات و جذبات کے زیر اثر وجود میں آنے والی تحریروں کا مجموعہ ہے۔ نیر مسعود نے جن شخصیت کے خاکے لکھے ہیں وہ اُن سے صرف واقف ہی نہیں تھے بلکہ گہرا جذباتی تعلق بھی رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے تمام خاکوں میں جذبات کی لہر محسوس کی جا سکتی ہے۔ اس کتاب میں رشید حسن خان، ڈاکٹر کیسری کشور، شہنشاہ مرزا، احتشام حسین، احتشام حسین (شخصیت کے چند پہلو)، صباح الدین عمر، محمود ایاز، شمس الرحمٰن فاروقی، ادیب کی ادبی شخصیت، ادبستان، چراغِ صبح اور عرفان صدیقی کے عنوان سے بارہ خاکے شامل ہیں۔ چراغِ صبح تاثراتی انداز کا لکھا ہوا خاکہ ہے۔ مجموعہ میں شامل ہر خاکے کا اپنا رچاؤ، اپنا انداز اور اپنا جواز ہے، تاہم کتاب میں موجود ان کے مکان کا خاکہ ادبستان ذہن پر مختلف قسم کا اثر چھوڑ جاتا ہے۔ ادبستان جو کہ نیر مسعود کا مکان تھا، اس کو ایک مکان کے طور پر نہیں بلکہ لکھنؤ کے تہذیبی سیاق کے طور پر پیش کیا ہے۔

ادبستان مختلف وقتوں میں حادثات و جذبات کے زیر اثر وجود میں آنے والی تحریروں کا مجموعہ ہے۔ ان خاکوں کی کتابی شکل میں اشاعت کے وقت نیر مسعود کو احساس تھا کہ شمس الرحمٰن فاروقی، محمود ایاز اور عرفان صدیقی کے خاکوں میں اضافے کی کافی گنجائش ہے لیکن فالج نے انھیں اس سے باز رکھا۔ کامیاب خاکے کے لیے شخصیت کو قریب سے جاننا ضروری ہے تبھی اس کے پیچ و خم پوری طرح واضح ہوتے ہیں۔ نیر مسعود نے جن شخصیات کے خاکے لکھے ہیں وہ ان سے صرف واقف ہی نہیں گہرا جذباتی تعلق بھی رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تمام خاکوں میں جذباتیت کی زیریں لہر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ رشید حسن خاں کے خاکے میں جذباتیت کی یہ لہر کچھ سبک ہوتی ہے تو ان کی حس مزاح ابھرتی ہے۔ رشید حسن خاں سے ان کو جذبات سے زیادہ علمی تعلق تھا لیکن رشید حسن خاں کی جملہ سازی جو ان کی تحریر کا بھی خاصہ ہے، ان کی

شخصیت کو روکھا اور بے رنگ ہونے سے محفوظ رکھتی ہے۔ رشید حسن خاں جس طرح اپنی تحریروں میں تیکھے جملے وضع کرتے تھے، گفتگو کے دوران میں بھی ان کا انداز کچھ ویسا ہی ہوتا تھا۔ اس بات کو نیر مسعود نے براہِ راست کہنے کی بجائے خاکے میں ملفوف کرکے پیش کیا ہے۔ رشید حسن خاں کے خاکے کی ابتدا ان کے خطوط کے اقتباسات سے ہوتی ہے، ان میں بھی ان کا شکایتی اور اپنے گرد و پیش سے ناامیدی کا انداز کچھ اسی انداز کے جملوں میں ابھرتا ہے جو صورتِ حال پر تلخ مگر ادائیگی کی سطح پر دل کش معلوم ہوتے ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> جلسہ ۷ بجے ہے۔ اگر آپ کچھ پہلے آجائیں تو خوب ہو۔۔۔۔۔ خدا جانے کیسے کیسے ہونقوں کا وہاں دیدار ہوگا اور کون کون غلام صورت بقول سیرت براجمان ہوگا! ابھی سے گھبرا رہا ہوں۔[1]

اس خاکے کو نیر مسعود نے مسلسل بیانیے کے انداز میں تحریر نہیں کیا بلکہ وہ درمیان میں وقفے قائم کرتے ہیں اور ان وقفوں کے ذریعے ماضی و حال کے درمیان ربط بناتے ہیں۔ یہ انداز دوسرے خاکوں میں بھی ہے۔ وہ اپنے بیان کی ابتدا یہاں سے کرتے ہیں کہ شمس الرحمٰن فاروقی سے طے ہوا کہ رشید حسن خاں سے ملنے چلنا ہے اور دونوں رشید حسن خاں کی قیام گاہ پر پہنچ جاتے ہیں، اور وقفہ بے وقفہ کے بعد نیر مسعود بیس پچیس برس پہلے رشید حسن خاں سے اپنی پہلی ملاقات کا بیان کرتے ہیں اور پھر بیان آگے بڑھتا جاتا ہے، پھر اگلے وقفے کے بعد بیان وہیں سے مربوط کر دیتے ہیں جہاں نیر مسعود، شمس الرحمٰن فاروقی کے ساتھ رشید حسن خاں کی قیام گاہ پر پہنچتے ہیں۔ خاکے کو رشید حسن خاں کی شخصیت کے علاوہ اسلوب اور تکنیک نے بھی دلکش بنایا ہے۔ رشید حسن خاں اپنے گرد و پیش کی ناہمواریوں پر بے لاگ اور اپنے مخصوص انداز میں تنقید کرتے تھے جس میں ایک نوع کی شرارت یا چھیڑ بھی ہوتی تھی، اِس کے برعکس نیر مسعود خاصے مروت پسند اور روادار طبیعت رکھتے تھے مگر رشید حسن خاں کی جملہ طرازیوں سے لطف اندوز بھی ہوتے رہتے تھے۔ رشید حسن خاں کی تحریریں تو یہی تاثر قائم کرتی ہیں کہ ایک شخص جو اپنی تحریروں میں اتنا احتجاج پسند اور شکوؤں کا خوگر ہے ذاتی زندگی میں بھی غیر دلچسپ شخصیت کا مالک ہوگا، لیکن اِن کا خاکہ اِس واہمے کو شکست دیتا ہے۔ نیر مسعود نے اِن کی طبیعت کے اسی تضاد کو تخلیقی مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ تخلیقی مہارت اِس

معنی میں کہ وہ اپنے ممدوح کی کسی خاص صفت کو براہِ راست یا زور دے کر بیان نہیں کرتے جو خاکہ نگاری کے بدترین عیبوں میں ہے مثلاً وہ یہ کہنے کی بجائے کہ موصوف بڑے بذلہ سنج یا بے باک تھے وہ ایسا واقعہ بیان کر دیتے ہیں کہ منشا بغیر راست دعوے کے روشن ہو جاتی ہے۔ اُنھوں نے پورے خاکے میں یہ نہیں بتایا کہ رشید حسن خاں غیر علمی لوگوں کو اپنے علمی کاروبار کا محرم نہیں بناتے تھے بلکہ اپنی پہلی ملاقات کا حال کچھ اِس طرح بیان کیا ہے:

> مزاج پرسویوں کے بعد ادھر ادھر کی باتیں شروع ہوئیں۔ میں نے 'فسانہ عجائب' کی پیش رفت کے بارے میں دریافت کیا۔
> "جی ہاں کام ہو رہا ہے"۔ انھوں نے بے دلی سے جواب دیا اور موضوع بدل دیا۔ کچھ دیر بعد میں نے پھر انھیں 'فسانہ عجائب' کی راہ پر لانا چاہا اور انھوں نے پھر سرسری جواب دے کر کوئی اور ذکر چھیڑ دیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس گفتگو سے گریز کیوں کر رہے ہیں۔ یہ ادائیں تو پی ایچ۔ ڈی کرنے والوں کی ہوتی ہیں۔ اتنے میں فاروقی صاحب نے کسی سلسلے میں میرا نام لیتے ہوئے میری طرف اشارہ کیا۔ رشید حسن خاں چونک کر بولے: "اچھا آپ نیر مسعود ہیں؟" فاروقی صاحب نے قہقہہ لگایا اور میں نے پوچھا: "میرا خط آپ کو نہیں ملا؟" "نہیں صاحب، بھائی آپ سے تو بہت سی باتیں کرنا ہیں"۔ خوب، کب آئے؟ اس 'فسانہ عجائب' نے تو۔۔۔"[۲۰]

ڈاکٹر کیسری کشور نیر مسعود کے بے تکلف دوستوں میں تھے، پیشے سے طبیب، ذوق سے شاعری کے مریض۔ اُردو سے بہت کم واقف تھے لیکن اُردو شاعری کو ہندی کے واسطے سے خوب پڑھا تھا۔ شاعری کا اچھا ذوق رکھتے تھے اور اچھے شعر کہتے تھے۔ ڈاکٹر کیسری کشور کا خاکہ ادبستان کے کامیاب خاکوں میں سے ایک ہے۔ نیر مسعود نے اس خاکے میں ڈاکٹر کیسری کشور کی شخصیت ذہانت، معصومیت اور انسان دوستی کی امتزاجی کیفیت کی تصویر کشی کی ہے:

> ڈاکٹر کیسری کشور کو اول اول میں نے لکھنو یونیورسٹی کلب میں دیکھا تھا جہاں وہ

کبھی کبھار آنکلتے تھے۔ میرا ان سے تعارف نہیں تھا لیکن اپنے ساتھیوں سے مجھے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ وہ میڈیکل کالج میں پڑھاتے ہیں، اُردو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے لیکن اُردو شاعری کا بہت اچھا ذوق رکھتے ہیں اور کلامِ غالب کے حافظ ہیں۔ اس کے بعد خبر ملی کہ وہ خود بھی شعر کہنے لگے ہیں۔ پھر ایک دو مشاعروں ان کا کلام سننے کا موقع بھی ملا۔ اسی دوران پروفیسر ولی الحق انصاری کے یہاں ایک شعری نشست میں ان سے ملاقات ہوئی۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے قریب آ کر کہا: ''کیوں جی ! سنا تم ہمارے کلام کی تعریف کرتے ہو؟''[۳]

اس خاکے کی خوب صورتی یہی ہے کہ ڈاکٹر کشور کے محاسن ان کی معصومیت اور شرارت، وسیع المشربی اور کچھ انسانی کمزوریاں مل کر ایسے انسان کی تصویر بناتی ہیں جو ہمارے ارد گرد کے چہروں میں سے ایک اور شناسا معلوم ہوتا ہے۔ نیر مسعود کو ان سے جذباتی لگاؤ تھا اور اس خاکے کا اختتام ڈاکٹر کشور کی جلتی چِتا کے منظر پر بڑے جذباتی انداز میں ہوتا ہے۔ اس کے باوجود نیر مسعود نے ایسا خاکہ کھینچا ہے جو دل کش اور زندگی سے معمور ہے۔ ڈاکٹر کیسری کشور کی سب سے نمایاں صفت شاعری ہے لیکن نیر مسعود نے ان کی شاعری پر گفتگو نہیں کی، حالاں کہ خاکے سے ہی پتا چلتا ہے کہ ان کے مجموعہ کلام ہنوز شیشہ گراں پر نیر مسعود کا تبصرہ ڈاکٹر کشور کی زندگی میں ہی شائع ہو چکا تھا۔

پروفیسر احتشام حسین اور مسعود حسن رضوی ادیب سے متعلق دو خاکے اس میں شامل ہیں۔ حالاں کہ ادیبؔ سے متعلق دوسرے خاکے 'چراغِ صبح' کو تاثراتی مضمون کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ادیبؔ ان کے والد ہونے کے علاوہ ان کے راہنما بھی تھے اور نیر مسعود 'اگر پدر نتواند پسر تمام کند' کے صحیح مصداق، ان کے افکار، خیالات اور رویے پر ادیبؔ کی شخصیت کا اثر واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ احتشام حسین کے خاکے ''احتشام صاحب (شخصیت کے چند پہلو)'' سے ہی یہ انکشاف ہوتا ہے کہ نیر مسعود کی کتاب تعبیرِ غالب کی اولین تحریک کا رشتہ احتشام حسین کے ایک سوال سے ہے:

بھئی یہ بتاؤ غالب کے اس شعر کا مطلب تم کیا سمجھتے ہو:

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک

کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

میں نے اسے سیدھا سادا شعر سمجھ رکھا تھا۔ اس لیے اس کا سیدھا سادا رائج الوقت مطلب بیان کر دیا لیکن فوراً ہی خیال آیا کہ غالب کے شعر کا مطلب احتشام صاحب کے سامنے بیان کر رہا ہوں۔ رُک کر ذرا غور کیا تو اعتراف کرنا پڑا کہ اس مفہوم کے لحاظ سے شعر دولخت معلوم ہو رہا ہے۔

ہاں! ہمارا بھی یہی خیال ہے۔ احتشام صاحب نے کہا۔ مگر غالب کا دولخت شعر کہنا سمجھ میں نہیں آتا۔

اس گفتگو کا اثر یہ ہو کہ میں کئی دن تک اس شعر کے بارے میں سوچتا رہا۔ آخر اس کا ایک بہتر مفہوم ذہن میں آیا۔ میں نے اس مضمون کی صورت میں لکھ کر عابد سہیل کے ماہنامہ 'کتاب' میں دے دیا۔ احتشام صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے اس مضمون کا حوالہ دے کر کہا کہ اب وہ شعر دولخت نہیں رہا۔ اس سے میری ہمت اتنی بڑھی کہ میں نے غالب کے دوسرے شعروں پر بھی غور کرنا اور ان کے مفاہیم کا سراغ لگانا شروع کر دیا اور یہ مضامین کا ایک سلسلہ بن گیا جس نے ایک مستقل کتاب (تعبیر غالب) کی صورت اختیار کر لی اور یہ کوئی تنہا مثال نہیں ہے۔ احتشام صاحب کی مختصر گفتگوؤں نے بہتوں سے مضامین اور کتابیں لکھوائی تھیں۔[۴]

محمود ایاز کے انتقال نے نیر مسعود کو بہت صدمہ دیا۔ وہ ادب کی کلاسیکی روایت سے بھی واقف تھے اور جدید رجحانات پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ ان کی مقناطیسی شخصیت نے اپنے گرد تمام اہم ادیبوں کا ایک حلقہ بنالیا تھا۔ زندگی اور ادب کے تئیں ان کا بانکپن اور جرات مندانہ رویہ لوگوں میں دل چسپی بھی پیدا کرتا تھا اور بیزاری بھی۔ اپنے دوستوں کے ساتھ حد درجہ خلیق اور ان کے آرام کی خاطر فکر مند رہنے والے شخص علمی معاملات میں اتنے بے مروت اور سخت گیر نظر آتے کہ طاقت وَر لوگوں کے کمزور مضامین و تخلیقات لوٹانے میں ذرا تامل نہیں کرتے تھے۔ ان کے اسی رویے نے ایک طبقے کو شاکی بنا دیا تھا۔ یہی

جرات مندانہ رویہ ان کا زندگی کے ساتھ بھی تھا۔ ان کے بارے میں یہ جملہ قطعاً روایتی نہیں کہ وہ موت سے آنکھ ملانے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ سلیمان اریب کے آخری دنوں میں کینسر کی شدت نے انھیں بولنے سے بھی معذور کر دیا تھا، محمود ایاز نے ان کو جو خط لکھا، اس اسے ان کے خاص مزاج و انداز کی ترجمانی ہوتی ہے:

> تمھاری نظم ملی۔ بڑی درد ناک، بڑی سفاک نظم تم نے لکھ دی ہے۔ میر ولی الدین نے اسلام کے فلسفۂ حزن یا غم پر ایک کتاب بڑی عمدہ لکھی ہے۔ حیدر آباد میں مل جائے گی۔ ان دنوں پڑھ ڈالو بلکہ صفیہ سے کہو وہ پڑھ کر سنائیں گی۔ مرنا جینا بہت معمولی باتیں ہیں۔ ان کی اہمیت جذباتی اعتبار سے صرف پسماندگان کے لیے ہوتی ہے، ورنہ مرنے والا بڑے مزے میں رہتا ہے۔[۵]

موت کے دہانے پر کھڑے شخص سے موت کے فوائد بیان کرنا محمود ایاز کا یہ انداز صرف دوسروں کے لیے نہیں تھا، وہ خود بھی اپنی موت کے سامنے اتنے ہی جرات مند نظر آئے۔ ان کی اسی جرات مندی کو نیر مسعود نے بھی ان کے ایک خط کے اقتباس کے ذریعے ابھارا ہے:

> میری صحت اچھی نہیں ہے۔ تنفس کی شکایت بہت بڑھ گئی ہے۔۔۔ بہ حیثیت مجموعی کوئی بہت خوش گوار کیفیت نہیں ہے دل و دماغ کی۔ جو لوگ گذر گئے ہیں ان کی یاد بہت آتی ہے۔ زندگی کے بارے میں یہ مصرع دہراتا رہتا ہوں، "تجھ سے طبیعت اپنی بہت سیر ہو گئی" یہ نہیں کہ بہت تنگ آگئے ہیں، جینا دوبھر ہو گیا ہے، بڑی پریشانیاں ہیں۔ نہیں، ایسا نہیں ہے۔ بس یوں محسوس ہوتا ہے کہ جی بھر کے سیر کر لی، خوب گھوم پھر کے دیکھ لیا۔ اب تھک گئے ہیں، گھر واپس چلیں اور سو جائیں۔[۶]

اس مجموعے میں ہر خاکے کا اپنا رچاؤ، اپنا انداز اور اپنا جواز ہے۔ اس لحاظ سے کسی ایک خاکے کو ممتاز کہنا ممکن نہیں، تاہم ان کے مکان 'ادبستان' کا خاکہ ذہن پر ایک مختلف قسم کا اثر چھوڑ جاتا ہے۔ نیر مسعود کی شخصیت پر لکھنو اور ادیب کا ایک خاص اثر ان سے پہلے تعارف میں ہی محسوس ہو جاتا ہے، ان کے افسانوں میں "ادبستان" کی صورت بار بار ابھرتی ڈوبتی محسوس ہوتی ہے۔ اس خاکے کو پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوا ہے کہ یہ ایک مکان نہیں بلکہ لکھنو کا ہی ایک تہذیبی استعارہ ہے۔ لکھنؤ کے نام وَر حکیم، ادبا، صنعت کار اسی

کے قریب و نواح میں آباد تھے۔ بٹوارے کے بعد جن مکانوں میں سناٹے کے پہرے تھے، یہ عمارت ان کی آبادی کی بھی گواہ رہ چکی تھی۔ ایک وقت ایسا بھی تھا جب اُردو ادیبوں کا لکھنؤ جانا ہی 'ادبستان' جانے کا جواز ہوا کرتا تھا۔ یہ عمارت برصغیر کے قریباً تمام اُردو ادیبوں کی ضیافت گاہ ہونے کے علاوہ ادب کے نہ معلوم کتنے تاریخ ساز منصوبوں کی گواہ اور یگانؔہ کی ایسے وقت میں پناہ بنی جب دل اور زمین دونوں ان کے لیے تنگ ہو گئے تھے۔ اس مکان کا ایک تعلق مرزا ہادی رسوا سے بھی ہے، جن کا شاہکار ناول امراؤ جان ادا لکھنوی تہذیب کا یادگار مرقع ہے:

> لکھنو کے محلّہ اشرف آباد کا یہ پورا علاقہ ہی دراصل قبرستان تھا۔ اس قبرستان کی زمین پر یہ حویلی مرزا محمد ہادی رسوا کے دوست سید جعفر حسین کے بیٹے سید حامد حسین نے بنوائی تھی۔ یہ وہی جعفر حسین ہیں جن کا ذکر مرزا رسوا نے اپنے سوانحی ناول شریف زادہ میں ان کے اصلی نام کے ساتھ کیا ہے۔ سید حامد حسین نے حویلی کے پہلو میں اس سے ملتی جلتی لیکن نسبتاً جدید طرز کی ایک عمارت اپنی سکونت کے لیے بنوائی اور حویلی کو خالی چھوڑ دیا۔[۲]

یہی حویلی جس نے اب ادبستان کا نام اختیار کر لیا ہے، نیر مسعود کی یادوں اور ان کی تخلیقات پر سایہ فگن نظر آتی ہے۔ یہ حویلی قبرستان کی زمین پر آباد ہے۔ قبرستان کے ساتھ موت کا اور موت کے ساتھ خوف کا تصور وابستہ ہے، خوف خود کے معدوم ہو جانے کا بھی اور ایک اجنبی وجود کے احساس کا بھی۔ اسی انجان خوف کے سایے سیمیا، بڑا کوڑا گھر، اوجھل وغیرہ میں ایک انجان خوف کے بیانیے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس عمارت کے بارے میں یہ بات بھی کہی جاتی تھی کہ ان روحوں کے سایے اس میں گردش کرتے ہیں جن کی قبروں پر اسے تعمیر کیا گیا ہے۔ دوسری طرف اس مکان نے نیر مسعود کو ایک ایسی فضا دی جس میں ہر وقت پڑھنے پڑھانے کا چرچا تھا۔ گویا اس عمارت کا ایک رشتہ توہمات سے تو دوسرا تحقیق سے تھا۔ نیر مسعود کے تخلیقی شعور کا خمیر اسی تحقیق و توہم کی مخلوط فضا میں تیار ہوا تھا۔

کسی عمارت کا خاکہ لکھنا شخصیت کا خاکہ لکھنے کی بہ نسبت دشوار تر ہے۔ شخصیت کے تعلق سے بے شمار واقعات و تجربات اور شخصیت کے پہلو قابل تحریر ہو سکتے ہیں لیکن عمارت کے تعلق سے جو واقعات

ساتھ دیتے بھی ہیں، ان سے تاریخی بیانیے کا کام تو لیا جاسکتا ہے لیکن ان سے خاکے جیسی کوئی تخلیق تیار کرنا جس میں صداقت بھی شرط ہے، دشوار ترین کام ہے۔ یہ صرف ایک حویلی کا خاکہ نہیں بلکہ کئی اہلِ کمال کا ذکر عناصر کی شکل میں مل کر ایک صورت اختیار کرتا ہے۔ انجینئر آغا امیر حسین جن کی نگرانی میں یہ عمارت از سرِ نو تعمیر ہوئی، ایک ناقابلِ فہم شخص تھے۔ انھوں نے باضابطہ طور پر فن تعمیر کی تعلیم حاصل کی تھی، اس کے باوجود ایسے کام کر جاتے تھے، جو کتابی علم کی رو سے ناممکن تھے:

> ادبستان کی بالائی منزل میں ایک دیوار ایسی بنائی تھی، جو فرش سے لگتی نہیں تھی۔ یعنی نیچے سے اوپر جانے کے بجائے یہ اوپر سے نیچے آئی تھی۔ ادیبؔ کو بھی جیسے انجینئر کو نئی آزمائشوں میں ڈالنے میں لطف آتا تھا۔ وہ آغاز سے ایسی فرمائشیں کرتے تھے جو کتابی علم کی رو سے ناممکن لگتے تھے، لیکن آغا اپنی ترکیبوں سے ہر ناممکن کو ممکن کر دیتے تھے۔ ادیب کی شخصیت اس خاکے کے مرکز میں رہتی ہے۔[۸]

نیر مسعود نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ اس مکان کی مجموعی ہیئت اور مالک مکان کی شخصیت میں ایک ہم آہنگی کا احساس ہوتا تھا۔ ''ادبستان'' کا کوئی تصور ان کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کے بعد بھی ''ادبستان'' آباد رہا اور بحمد اللہ آج بھی ہے لیکن ادیبؔ کے بعد یہاں ہر آنے والا سب سے ملنے کے بعد بھی ایک بے نام تشنگی دل میں لے کے جاتا ہے۔ جن لوگوں نے ادیبؔ کو دیکھا تھا ان کے لیے ایک مسئلہ ہے۔ ادیبؔ اپنے آخری ایام میں حافظے کی توانائی کھو چکے تھے۔ اپنے حافظے کو جانچنے کے لیے وہ انیس سے متعلق کتابوں کو منگواتے اور جلد کے ذریعے ان کو پہچاننے کی کوشش کرتے، کبھی ''ادبستان'' کی تصویر منگوا کے اس کے نقشے کو دوبارہ ذہن نشیں کرنے کی ناکام کوشش کرتے۔ ''ادبستان'' سے ان کو کس نوع کا جذباتی تعلق تھا، اس واقعے کے ذریعے سمجھا جاسکتا ہے۔ اپنے ارمانوں کی عمارت کا نقشہ ذہن سے محو ہونا انسان کے خود اپنے اوپر اختیار کی حد بتاتا ہے:

> ان خاکوں میں چند لوگوں کے مزاج و اطوار ہی نہیں ایک عہد سمٹ آیا ہے۔ مسعود حسن رضوی کا عہد اُردو ادب کا ثروت مند عہد کہا جاسکتا ہے۔ ان کے ارد گرد علما و ادبا کی جو کہکشاں جمع ہو گئی تھی وہ بعد والوں کے لیے کسی حسین خواب یا دل کش افسانے

> سے کم نہیں۔ بعض علمی اختلاف کے باوجود سب کا ایک دوسرے کا قدردان ودستگیر ہونا ایسا وصف ہے جو اس تنگ دلی کے عہد میں وہم معلوم ہوتا ہے۔[۹]

نیر مسعود کی خاکہ نگاری کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ جن شخصیات کا ذکر کرتے ہیں ان سے ان کا گہرا ذاتی اور جذباتی تعلق ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کے خاکوں میں ایک ہلکی سی جذباتی فضا موجود رہتی ہے، مگر یہ جذباتیت کبھی مبالغہ یا خطیبانہ انداز اختیار نہیں کرتی۔ مثال کے طور پر رشید حسن خاں کے خاکے میں نیر مسعود نے براہِ راست تعریف کے بجائے واقعات اور مکالموں کے ذریعے ان کی شخصیت کے مختلف پہلو اجاگر کیے ہیں۔ ان کا اندازِ بیان مسلسل بیانیہ نہیں بلکہ وقفوں اور یادداشتوں کے ذریعے آگے بڑھتا ہے۔ وہ حال سے ماضی میں جاتے ہیں اور پھر دوبارہ حال میں آکر بیان کو مربوط کر دیتے ہیں۔ اس تکنیک سے خاکے میں ایک ادبی کشش اور فنی تنوع پیدا ہوتا ہے۔

اسی طرح ڈاکٹر کیسری کشور کے خاکے میں نیر مسعود نے ایک ایسی شخصیت پیش کی ہے جس میں ذہانت، معصومیت اور انسان دوستی کا امتزاج نظر آتا ہے۔ اگرچہ ڈاکٹر کشور اُردو زبان سے پوری طرح واقف نہیں تھے، لیکن اُردو شاعری کا عمدہ ذوق رکھتے تھے اور غالب کے کلام سے خاص شغف رکھتے تھے۔

نیر مسعود کے خاکوں میں ادبی شخصیات کے ساتھ ساتھ پورے عہد کی جھلک بھی ملتی ہے۔ مثال کے طور پر احتشام حسین کے خاکے میں ان کی علمی گفتگو کا اثر دکھایا گیا ہے جس نے نیر مسعود کو غالب کے اشعار پر غور و فکر کی طرف مائل کیا اور بالآخر ان کی کتاب تعبیرِ غالب کی بنیاد پڑی۔ اسی طرح محمود ایاز کے خاکے میں ان کی بے باک شخصیت، علمی سخت گیری اور زندگی کے بارے میں ان کے جرات مندانہ رویے کو خطوط اور واقعات کے ذریعے نمایاں کرکے ان کی شخصیت کے تضادات کو بڑی تخلیقی مہارت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ تاہم ''ادبستان'' کے عنوان سے اُن کے گھر کا خاکہ لکھنؤ کا مکمل تہذیبی سیاق رکھتا ہے:

> کتاب کا سب سے منفرد خاکہ ''ادبستان'' ہے جو دراصل ایک عمارت کا خاکہ ہے۔ یہ عمارت لکھنؤ کی ادبی فضا اور تہذیبی روایت کی علامت بن کر سامنے آتی ہے۔ اس کا تعلق مرزا ہادی رسوا اور ان کے ناول امراؤ جان ادا سے بھی جوڑا گیا ہے۔ اس عمارت کے ماحول میں تحقیق، روایت اور توہمات کی ملی جلی فضا نے نیر مسعود کے

تخلیقی شعور کو تشکیل دیا۔[۱۰]

مجموعی طور پر ادبستان کے خاکے صرف افراد کی شخصیات کا بیان نہیں بلکہ ایک پورے ادبی عہد کی تہذیبی اور فکری تصویر پیش کرتے ہیں۔ نیر مسعود کی خاکہ نگاری کی اصل قوت یہی ہے کہ وہ براہِ راست تعریف یا تنقید کے بجائے واقعات، مکالموں اور یادوں کے ذریعے شخصیت کے اصل خدوخال کو نمایاں کرتے ہیں اور ان خاکوں کے ذریعے اُس عہد کی لکھنوی تہذیب کو اُجاگر کرتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ نیر مسعود، ''رشید حسن خاں''، مشمولہ: ادبستان (کراچی: شہرزاد، ۲۰۰۶ء)، ۵۔
۲۔ ایضاً، ۱۱۔
۳۔ نیر مسعود، ''ڈاکٹر کیسری کشور''، مشمولہ: ادبستان، ۱۸۔
۴۔ نیر مسعود، ''احتشام صاحب''، مشمولہ: ادبستان، ۳۸۔
۵۔ نیر مسعود، ''محمود ایاز''، مشمولہ: ادبستان، ۵۸۔
۶۔ ایضاً، ۸۷۔
۷۔ نیر مسعود، ادبستان، ۱۱۰۔
۸۔ شمیم حنفی، ہمسفروں کے درمیاں (دہلی: انجمن ترقی اُردو، ۲۰۰۵ء)، ۱۷۱۔
۹۔ عابد سہیل، ''نیر مسعود''، مشمولہ: سہ ماہی ادب ساز (دہلی: شمارہ ۳، اپریل جون ۲۰۰۷ء): ۱۷۲۔
۱۰۔ شمیم حنفی، ہمسفروں کے درمیاں، ۱۷۵۔